دوسرے دینی اداروں اور تحریکوں کے بارے میں ہمارا طرز عمل

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

صورت حال یہ ہے کہ جہاں ہمارے رفقائے کار دعوت اصلاح وتبلیغ کا کام کرتے ہیں وہاں پہلے سے کچھ دینی ادارے موجود ہوتے ہیں اور اکثر جگہ کوئی دینی تحریک بھی ہوتی ہے، لہٰذا ہمارے لئے غور وفکر کرنے اور ایک اصول طے کر لینے کی ضرورت ہے کہ ہمارا رویہ عام دینی اداروں اور تحریکوں کے ساتھ کیا ہو۔

سب سے پہلے ایک اصول بیان کیا جاتا ہے جس سے ایسے مواقع پر ہمیں رہنمائی حاصل ہوگی اور وہ ایک مستقل معیار کا کام دے گی، جس سے ہم اپنا طرز عمل اور رویہ معین کر سکیں گے۔

دین کا جو حصہ ہم تک پہنچا ہے اس کی دو قسمیں کی جا سکتی ہیں: ایک تو وہ حصہ ہے جو اپنی خاص ہیئت وشکل کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے اور اس کی ہیئت وشکل مطلوب ہے اس کو ہم ''منصوص بالوضع'' کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ دینی امور میں جو اپنی خاص ہیئت وصورت کے ساتھ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، مثلاً: ارکان دین اور بہت سے ایسے فرائض جن کو نہ صرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے بتایا، بلکہ ان کی شکلیں زبانی بھی بتائیں اور خود کر کے بھی دکھلائیں، مثلاً: نماز، حج، وضو، وغیرہ۔

دین کا دوسرا حصہ وہ ہے کہ اس میں نفس شے مطلوب ہے لیکن بہت سی حکمتوں اور مصلحتوں کی بناء پر (زمانہ کی تعریف اور راحت کے لئے وسعت اور سہولت کا خیال کر کے) آپ نے ان کی شکلیں متعین نہیں کیں۔ صرف شے بتلا دی کہ یہ مقصود ہے، یہ چیزیں جو خود منصوص ہیں۔ لیکن ان کی کوئی خاص وضع مخصوص تھیں، مثلاً: جہاد فی سبیل اللہ، دعوت اللہ، علم و دین کے سلسلہ کو چلانا اور احکام شرعیہ کا امت تک پہنچانا، یہ سب امت سے مطلوب ہے اگر امت ان کو چھوڑ دے اور بالکل ترک کر دے تو وہ گناہ گار ہوگی۔

صرف یہ اعمال مقصود ہیں۔ان کی کوئی خاص شکل اور طریقہ متعین نہیں کیا گیا، بلکہ اس بارے میں امت کی عقل پر اعتماد کیا گیا ہے اوران فرائض کی ادائیگی کو اس کی صلاحیتوں پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

غیر منصوص بالوضع کی واضح مثال لباس کا مسئلہ ہے،لباس ساتر ہو،ٹخنوں سے اونچا ہو، گھٹنوں سے نیچا ہو، تفاخر اور تکبر کا لباس نہ ہو، کوئی حرام وناجائز ، مثلاً: مردوں کے لئے ریشم نہ ہو، پس لباس بھی منصوص اور اس کی یہ شرائط بھی منصوص ہیں،لیکن لباس کی شکل، لباس کا رنگ اور اس کی قطع وغیرہ، غیر مخصوص ہیں، اس میں امت کے لئے بہت سی سہولتیں ہیں، اس کو امت کی تمیزدار عقل عام پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

دوسری مثال مساجد کی ہے، مساجد بھی مطلوب ہیں اور مساجد کی نظامت بھی مطلوب ہے کہ ان میں ذکر اللہ ہو اور وہ دوسرے مقامات سے ممتاز ہوں، مگر ان کا کوئی خاص طریقہ مطلوب نہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ عالم اسلام میں مساجد مختلف وضع کی پائی جاتی ہیں، یہاں تک کہ مینار سے مساجد کے لئے شرائط نہیں تھیں، ہندوستان کی مسجدوں میں دو میناروں کا رواج ہے، الجزائر ومراکش کی مساجد میں ایک مینار ہوتا ہے اور دنیا کی سب سے بڑی اور پہلی مسجد (بیت اللہ) کا کوئی مینار نہیں۔

اب دعوت الی اللہ کی مثال لیجئے ،اللہ کی طرف بندوں کو بلانا فرض ہے۔انفرادی ہو یا اجتماعی تقریر سے ہو یا تحریر سے، علانیہ یا خلوص میں، اس میں کوئی شکل متعین نہیں۔نوح علیہ السلام کی زبان سے قرآن پاک میں واضح کر دیا گیا کہ دعوت کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں۔﴿قال رب انی دعوت قومی لیلا ونهاراً﴾ حضرت نوح نے (حق اللہ کی بارگاہ میں) کہا: اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کے سامنے رات میں بھی دین کی اور توحید کی دعوت رکھی اور دن میں بھی، ﴿ثم انی دعوتهم جهاراً﴾ پھر میں نے خوب پکار کر اور چیخ کر بھی ان کو بلایا، ﴿ثم انی اعلنت لهم واسررت لهم اسراراً﴾ پھر میں نے بالاعلان بھی آپ کا پیغام ان کو پہنچایا اور چھپ چھپ کر تنہائیوں میں بھی ان سے آپ کی بات کہی۔ لہٰذا دعوت دین کا کام کرنے والے ہر فرد وجماعت کو اختیار ہے کہ وہ اپنے لئے جو طریقہ صحیح جانے وہ مقرر کرے اور اپنی تحریک کا جو طرز مناسب سمجھے وہ اختیار کرے، اس میں کسی کو جائز اور ناجائز لکھنے یا کوئی روک ٹوک لگانے کا حق حاصل نہیں ہے۔

اس وقت عام طور پر دین کے ان دونوں حصوں کو خلط ملط کیا جاتا ہے، منصوص کو غیر منصوص کا درجہ دیا جاتا ہے اور غیر منصوص کو منصوص کے مقام پر پہنچا دیا جاتا ہے اس کے نتیجے میں مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں اور مختلف اداروں اور تحریکوں میں اکثر تنازعہ کی شکل پیدا ہو گئی۔اگر ہم ان چیزوں میں فرق سمجھ لیں تو بہت ہی مشکلات حل ہو جائیں گی، سینکڑوں تنازعوں کا سدباب ہو جائے گا اور بہت سی ذہنی الجھنیں ختم ہو جائیں گی۔

چیزوں کی اصلی ہیئت سمجھنے اور ان کو ان کے صحیح مقام پر رکھنے کا یہ پیمانہ ہمارے ہاتھ آ گیا۔اس کے بعد صحیح اصول پر چلنے والی اور مخلصانہ دینی تحریکیوں، دینی اداروں کے درمیان تقابل، تصادم اور اختلاف کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔فرق جو

۔ہ جاتا ہے وہ صرف اپنے اپنے تجربوں اور حالات کے مطالعہ کا ہے کہ کام کون سی شکل میں اور کس طریقہ سے زیادہ موثر اور نتیجہ خیز ہے اور کس سے وہ نتائج ومقاصد ظاہر ہوتے ہیں جو اس کام سے مطلوب ہیں، دعوت الی اللہ کی شکل اور طرز میں ہر جماعت اور ادارہ آزاد ہو، اس کو کسی خاص شکل یا طرز پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے، جیسے کسی کو اپنے تجربہ اور مطالعہ کا پابند نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کوئی جماعت اگر کسی خاص طریقہ کار کو اختیار کرتی ہے (بشرطیکہ وہ دین کے اصول وآداب کے مخالف نہ ہوں) تو وہ اپنے فیصلہ میں حق بجانب ہے، ہم اپنے مخصوص طرز کار کو بہتر اور احیاء دین کے لئے مفید سمجھتے ہیں تو یہ اپنی جگہ ٹھیک ہے، ہم اپنی طرز کار کو دوسری تحریکوں اور اداروں کے داعیوں کے سامنے بہتر طریقہ سے پیش کرسکتے ہیں۔ لیکن اگر صرف طرز کار کے فرق کی وجہ سے ہم ان کو غلط کار اور کسی گناہ کا مرتکب سمجھیں تو ہم غلطی پر ہیں۔ ہم صرف اتنا کرسکتے ہیں کہ ان سے دوبارہ غور کرنے اور نتائج کو دیکھنے اور ان کا موازنہ کرنے کی درخواست کریں لیکن ان کے ساتھ ایک گمراہ فرقہ کا سا معاملہ کرنا، ان کو جاہل اور گمراہ سمجھنا غلط اور لغو ہے۔

ہماری اس دینی تحریک ''دعوت اصلاح وتبلیغ'' کا ایک خاص طرز ہے۔ اس میں تبلیغی گشت ہے، اجتماعات ہیں، ذکر اللہ پر، اکرام مسلم پر اور ترک لایعنی پر زور ہے اور دین کے لئے گھر سے نکلنے اور وقت اور عادات ومالوفات کی قربانی کی ترغیب ہے، وغیرہ وغیرہ، ان میں بعض چیزیں وہ ہیں جن کی ہمیں شریعت نے سختی کے ساتھ تاکید کی ہے۔ مثلاً: اکرام مسلم، ذکراللہ کی کثرت، ترک، لایعنی وغیرہ لیکن بعض چیزیں، مثلاً: گشت، اجتماعات وغیرہ ہیں جو انتظامی امور ہیں، یہ حدیث وقرآن سے استنباط کئے جاسکتے ہیں۔ وہ اصولی طور سے صحابہ کرامؓ کی زندگی میں ملیں گی لیکن خاص اس ہیئت میں ہی ملیں گی یہ سب چیزیں اجتماعی اور تجربی ہیں ان چیزوں پر یا ان خاص شکلوں پر ہر جگہ اور ہر شخص سے منصوص چیزوں کی طرح اسرار کرنا صحیح نہیں ہیں۔

سب سے مشکل چیز اعتدال ہے۔ انبیاء علیہم السلام میں اعتدال بدرجہ اتم ہوتا ہے، ہم صاف کہتے ہیں کہ یہ بالکل امکان ہے کہ پچیس برس کے بعد اللہ کے کچھ بندے پیدا ہوں جو صاحب نظر بھی ہوں اور اللہ کے ساتھ ان کا تعلق ہو اور ہمارے اس طریقہ میں زمانہ کی ضرورت اور تقاضے کے لحاظ سے تبدیلیاں کریں، اس وقت اگر ایک جامد طبقہ اس کی مخالفت ہمارا نام لے کر محض اس بناء پر کرے کہ ہمارے بزرگ ایسا کرتے تھے تو اس کا رویہ غلط ہوگا اس کا اصرار ہٹ دھرمی ہوگا، کبھی کبھی ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری اس تحریک میں بھی ایک طبقہ یہ سمجھنے لگا ہے کہ یہی طریقہ کار اور یہی طرز دین کی خدمت اور احیاء کے لئے ہمیشہ کے واسطے اور ہر جگہ کے لئے ضروری ہے اور اس کے علاوہ سب غلط ہے، جب تک اس منصوص طریقہ پر تقریر نہ ہو، اسی خاص ڈھنگ پر اور ان ہی ساری پابندیوں پر گشت نہ ہو اور اجتماعات میں مقررہ طریقہ سے دعوت نہ دی جائے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ساری جدوجہد رائیگاں گئی اور جو کچھ ہوا سب فضول ہوا۔ یہ بے اعتدالی ہے اور یہ رویہ خطرناک ہے، اس لئے کہ اسی طرز عمل کی وجہ سے مختلف مذاہب اور فرقے امت میں پیدا ہوئے ہیں، اصل

حقیقت صرف اتنی ہے کہ اب تک غور اور تجربوں نے ہمیں یہاں تک پہنچایا ہے کہ ہر تقریر کے بعد جہد و عمل کی دعوت ضرور دی جائے۔ ہر بستی میں ایک مرکزی اجتماع ضرور ہو، رات کو مساجد میں قیام ہو، وغیرہ وغیرہ، پس جب تک یہ چیزیں فائدہ مند معلوم ہوتی ہیں ہمیں اس وقت تک ان کو جاری رکھنا چاہئے، لیکن اگر ہفتہ کا اجتماع ہمارے شہر لکھنؤ کی نوچندی جمعرات کی طرح ایک رسم بن جائے، رات کا قیام رت جگا کی طرح رسمی ہو جائے اور دین کے کام کے لئے چلنا ایک رسم بن جائے تو یہ ایک مذہب بن جائے گا اور ایک بدعت قائم ہو جائے گی اور اس وقت کے ربانی مصلحین کا فرض ہوگا کہ ان کے خلاف جدوجہد کریں اور ان رسومات کو مٹائیں، بہت سی چیزیں صحیح مقاصد اور دینی مصلحتوں سے شروع ہوتی ہیں لیکن آگے چل کر غلط صورت اختیار کر لیتی ہے، ایسے موقع پر حقیقت و رسم، سنت و بدعت، فرض و مباح میں تمیز کرنا تفقہ فی الدین ہے اور کہنے والے نے کہا ہے، اگر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی۔

اگر ہماری تحریک کی ہم عصر دینی تحریکیں اور ادارے منصوص چیزوں کو مقصد بنائے ہوئے ہیں اور اپنی مخلصانہ صوابدید مطابق کسی طرز پر کام کر رہے ہیں تو ہمارا ان سے کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہئے، بلکہ ہمیں ان کے کام کا اعتراف کرنا ہئے، ان کو کامیابی کی دعائیں دینی چاہئیں اور ان سے تعلقات بڑھانا چاہئے، اسی لئے کہ وہ دین کے بعض اہم شعبوں کو سنبھالے ہوئے ہیں اور اس طرح انہوں نے ہمیں یہ موقع دیا ہے کہ ہم ان دوسرے کاموں سے مطمئن ہو کر اپنا کام کریں۔ حضرت مولانا الیاسؒ مدارس کے لئے دعائیں کرتے تھے اور اپنے خاص محبین کو ان کی اعانت کرنے کی طرف توجہ دلاتے تھے، مولانا اپنے اہل تعلق کو اس کی طرف بھی متوجہ کرتے تھے کہ علماء کی ملاقات کے لئے جایا جائے اور ان سے تعلقات بڑھائے جائیں اور ان کے حقوق (اکرام و محبت اور تعاون) ادا کئے جائیں۔

یہاں ایک باریک بات سمجھ لیں، وہ یہ ہے کہ ایک نبی ہوتا ہے اور ایک مجدد اور مصلح ہوتا ہے، نبی کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کے بتائے ہوئے طریقے کے اتباع کے بغیر نجات ہی نہیں ہو سکتی اور اس کی ہدایت حاصل کئے بغیر اللہ کی رضا اور کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی، اس میں کسی قسم کی مدارت یا تساہل کی گنجائش نہیں ہے، لیکن مجددین اور مصلحین کا معاملہ یہ نہیں ہے، ہر مجدد اور ہر ربانی مصلح کے طریقے کی پیروی سے دین کو اور دین کے طالبوں کو نفع پہنچتا ہے، مثلاً: کسی مجدد کے طریقے سے قربانی کے جذبات بڑھتے ہیں، لہٰذا اس کے طریقہ کی پیروی سے قربانی کے جذبات بڑھیں گے اور ایک دوسرے مجدد کے طریقہ سے انفاق فی سبیل اللہ کے جذبات پیدا ہوتے ہیں لہٰذا اس کے اثر سے انفاق و ایثار کے جذبات پیدا ہوں گے، ایک دوسرے مجدد کے طریقہ سے، مثلاً: صفائی معاملات میں پختگی آتی ہے تو صفائی معاملات کے سلسلہ میں اس سے تعلق اور استفادہ خاص طور پر موثر ہوگا۔

بہر حال نبی کے طریقہ پر تو نجات کا انحصار ہوتا ہے اور بالکل اسی طریقہ پر چلنا لازم ہوتا ہے، لیکن کسی مجدد اور مصلح کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ خاص خاص ترقیاں تو ان کی اتباع اور ان کے ساتھ وابستگی سے ہوتی ہیں لیکن نجات اس پر منحصر نہیں

ہوتی۔ ایک بات یہ بھی واضح ہونی چاہیئے کہ امت میں طبقات کا اتنا اختلاف ہے، اذہان کا اتنا تفاوت ہے اور حالات ایسے مختلف ہیں کہ کوئی تحریک یہ دعویٰ نہیں کرسکتی کہ وہ تمام طبقات کو متاثر کرسکتی ہے اور ان کی تسکین کا سامان کرسکتی ہے اور ان کی استعداد کے مطابق دینی غذا فراہم کرسکتی ہے۔ کوئی ذہن تقریر سے متاثر ہوتا ہے، کسی پر لٹریچر اثر انداز ہوتا ہے اور کوئی کسی دوسرے ذریعہ سے متاثر کیا جاسکتا ہے، اسی طرح ایک طریقہ کار سے ہر جگہ، ہر ماحول میں اور ہر حالت میں کامیابی مشکل ہے، اس حقیقت کو سمجھنے اور اس کے مطابق چلنے سے لوگوں سے بڑی غلطیاں ہوتی ہیں، بہت سے لوگ قابل قدر اور بڑے مخلص ہیں لیکن ان لوگوں کا اس وقت تک دل خوش نہیں ہوتا، جب تک کہ ہر شخص انہیں مخصوص طرز پر کام نہ کرے اور سب ایک ہی کام کرنے لگیں، حالانکہ عمومی وانقلابی تحریکوں کا معاملہ یہ نہیں ہوتا، وہاں ہر چیز اس کے صحیح مقام پر رکھی جاتی ہے اور ٹھیک چوکھٹے پر بٹھائی جاتی ہے ہر شخص سے وہی کام لیا جاتا ہے جس کا وہ زیادہ اہل ہے اور اس میں وہ دوسروں سے ممتاز ہے اور جس کو وہ دوسروں کے مقابلہ میں بہتر طریقہ پر انجام دے سکتا ہے۔

ہمیں تو دوسری دینی کوششیں اور ان کے ذمہ داروں کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ انہوں نے بہت سے لوگوں کو سنبھال رکھا ہے جو ہماری گرفت میں نہیں آسکتے ہیں، یہ اللہ کی طرف سے انتظام سمجھنا چاہیئے کہ جو کچھ لوگ اس راستہ سے دین تک آجائیں اور کچھ اسی راستہ سے آجائیں اور اپنے طریقہ کار کو مناسب طریقہ سے ان کے سامنے اکثر بیشتر پیش کرتے رہنا چاہیئے، لیکن اس طرح نہیں کہ وہ سمجھیں کہ یہ ہمارے درپے ہیں اور ہاتھ دھوکر ہمارے پیچھے ہی پڑ گئے ہیں، نہ ان کے سامنے آپ اپنی دینداری کا اظہار کریں اس طرح آپس کے تنازعات ختم ہوجائیں گے، ایک دوسرے کی طرف سے دل صاف ہوجائیں گے اور امت کے مختلف طبقات اور جماعتوں میں تعاون علی البر والتقویٰ کرنے کی اور خدا ترسی پر ایک دوسرے کی امداد کی استعداد پیدا ہوجائیں گی جو عرصہ سے مفقود ہوچکی ہے اور جس کی اس زمانہ میں جب کہ باطل مختلف شکلوں اور حربوں کے ساتھ حملہ آور ہے اور اہل باطل من کل حدب ینسلون ہر ٹیلے اور ٹاپو سے (ابلے چلے آرہے ہیں) کا مصداق ہیں، سخت ضرورت ہے۔

☆......☆......☆

امام اعظم ابوحنیفہؒ کے پڑوس میں ایک رافضی نے اپنے دو خچروں کا نام ابوبکر وعمر رکھا تھا (روافض کی ایسی ذلیل حرکتیں بہت معروف ہیں) ایک روز ایک خچر نے لات مار کر اس رافضی شخص کا پیٹ پھاڑ دیا، امام اعظم رحمہ اللہ کو خبر ہوئی فوراً فرمایا: یہ وہ خچر ہوگا جس کا نام اس نے عمر رکھا تھا، اس نام کا یہی اثر ہونا چاہیے تھا، چنانچہ تحقیق کی گئی تو اس کی تصدیق ہوگئی۔

ناموں اور الفاظ میں بھی حق تعالیٰ نے بڑی تاثیر رکھی ہے، ایک لڑکے کا نام والدین نے کلیم اللہ رکھا وہ اکثر بیمار رہتا تھا، حضرت تھانویؒ نے اس کا نام بدل کر سلیم اللہ رکھ دیا اس وقت سے تندرست رہنے لگا، کیونکہ کلیم کے معنی معروف مجروح اور زخمی کے ہیں۔